اسلامی تشکیلِ تعلیم

اُردو سائنس بورڈ کا سوال نامہ اور جوابات

نعیم صدیقی

(۲)

سوال نمبر (۳)

نصابات اور نصابی کتابوں کے متعلق پہلے کئی بار اہلِ علم کے مشوروں اور ماہرینِ تعلیم کی آرا کی روشنی میں نقشۂ کار بنے سان کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ نیز بڑی بڑی عالمی، اسلامی اور دینی یونیورسٹیوں اور ان کے ماتحت تعلیمی بورڈوں سے نصابات حاصل کر کے جائزہ لینا۔

نصاب مرتب کرتے ہوئے ہر سطح کے لحاظ سے دو باتیں طے کرنی ہوں گی:

ایک یہ کہ آج تک کے فلسفوں، علوم انسانی اور علوم تجربی کے فراہم کردہ سرمایۂ دانش سے کیا کیا کچھ درجہ بدرجہ لینا ہے۔

دوسرے یہ کہ ان علوم پر جوانانِ پاکستان کی خودی اور ان کے ایمان کی گرفت کو مضبوط رکھنے کے لیے عقاید، افکار، احکام اور علمی و اجتہادی کاموں، نیز اپنی مادّی اور تجربی ترقیات سے کتنا کچھ شامل کرنا ہے۔

یہ نازک کام اس طرح ہونا چاہیے کہ دو الگ الگ علمی دھارے نوجوانوں کے ذہنوں میں نہ بہنے لگیں۔

ایک دینی اور ایک دنیوی (یا لادینی)۔ اور اس طرح بھی نہیں ہونا چاہیے کہ دونوں علوم یعنی ایک الہامی علم ہدایت اور دوسرے قیاسی، حواسی اور تجرباتی علم کو آپس میں ٹکرا دیا جائے۔ اور مستقلاً ہر ذہن میں ایک الجھاؤ پیدا کر دیا جائے۔ یا ایسے الگ الگ گروہ ابھر کھڑے ہوں جو برسر کشمکش رہیں، مگر اسلام ہی کے برتر مقاصد کے لیے تعاون نہ کر سکیں۔

اب ہمیں الگ الگ طالب علموں کے گروہ جمع کر کے کسی کو مذہبی عالم اور کسی کو سائنس دان اور ڈاکٹر اور انجینئر بنانے کا طریقہ ترک کر دینا چاہیے۔ (ہو سکتا ہے کہ اس نقشہ کے اول عمل میں چند سال لگ جائیں کیونکہ دوطرفہ ذہنوں اور ان کی قیادتوں میں اعتماد پیدا ہو جانا چاہیے) ہم چاہتے ہیں کہ مسلمان مفسر اور مسلمان قانون دان اور مسلمان قاضی کی طرح مسلمان ڈاکٹر اور مسلمان انجینئر اور مسلمان ماہرین جوہری توانائی اور مسلمان کمپیوٹر ایکسپرٹ یا مسلمان خلا باز ہم ایک ہی نظامِ تعلیم سے حاصل کریں۔ یہ سب لوگ ایک ہی خدا پرستانہ اخلاقی اسپرٹ اور فلاحِ انسانیت کے ایک ہی نصب العین سے سرشار ہوں۔ شاید یہ وحدانی سسٹم تشکیل پانے میں کچھ وقت لے گا۔

جہاں تک نصابی کتابوں کا تعلق ہے، اس تصور کے ساتھ تیار کی جائیں کہ ہمیں خدا کی زمین پر، خدا کے خلیفہ کی حیثیت سے، اس کے تفویض کردہ فرائض کو، اس کی ہدایات کے مطابق ایک امتحان کی طرح انجام دینا ہے۔ یہ پس منظر جس بھی مضمون کے ساتھ، ادنیٰ یا اعلیٰ درجوں میں کام کرے گا اس مضمون میں یہ روح پیدا ہو جائے گی کہ کر گھا چلانے والا ایک مزدور، میزائیل چھوڑنے والا ایک سپاہی، معلومات کے نئے نئے شکار کرنے والا ایک خلا نورد یہ جذبہ رکھے گا کہ میں اللہ تعالیٰ کی مرضی پوری کر رہا ہوں لہٰذا یہ مقامِ عبادت ہے۔

ہمیں چاہیے کہ ہر مضمون کے لیے پہلے موجود اور مروّج کتابوں پر نظر ڈالیں۔ مثلاً نفسیات کے بارے میں آپ ولیم جیمز، فرائیڈ، ینگ، ایڈلر، برٹرینڈ رسل وغیرہ بے شمار مفکرین کی کتابیں (اور ان کے ضروری حصے یا خلاصے) سامنے رکھیں۔ اِدھر سے آپ نفسیاتی احوال کے متعلق قرآن کی آیات (مع مختلف مفسرین کے تفسیروں کے مباحث کے) حضورِ پاک کی خاص خاص احادیث (اور ان کی شروح) کو سامنے رکھیں، پھر مؤلف اخلاقِ جلالی اور تصانیف امام غزالی و دیگر تصانیف کو سامنے رکھیں، علاوہ ازیں دورِ حاضر میں جن مسلم اہلِ فکر نے مغربی نفسیات پر تنقید کرتے ہوئے اسلامی نقطہ نظر سے کوئی کتاب یا مقالہ

لکھا ہو وہ بھی جمع کر لیں ۔ پھر آپ کے نظامِ تعلیم کے لیے نصابی کتابیں لکھنے والے ان دو طرفہ معلومات کو اس طرح جمع کریں کہ اسلامی حکمتِ نفسیات غالب رہے ۔ مثلاً جدید نفسیات ہمیں ہر طرف سے گھیر گھار کر نفسیاتی جبریت کے کلیہ تک لے آتی ہے، جس میں انسان جکڑا ہوا ہے ۔ مگر اسلامی نفسیات یہ بتاتی ہے کہ نفس میں کام کرنے والی قوتوں کے تانے بانے کو توڑ کر جب چاہے انسان خودی اور قوتِ ارادی کے زور سے آزاد ہو سکتا ہے، ہاں اگر وہ اس حالت پر راضی ہو کر (تن بہ تقدیر) پڑا رہے تو پھر نفسیاتی قوتیں مختلف قسم کے جالے ۔۔۔ مثلاً عادت کا جالا ۔۔۔ اس کے گرد لپیٹتی رہتی ہے ۔ اس کے باوجود اسلامی تصور یہ ہے کہ انسان کی خودی اتنی زبردست چیز ہے، دوسرے لفظوں میں اس کی قوتِ ارادی اور قوتِ فیصلہ جب ایک بار آگ آتی ہے تو پھر اگر اس کے اوپر سِل بھی رکھی ہو تو وہ سِل کو بھی چیر کر باہر آجاتی ہے ۔

اِس طرح تمام علوم میں کوشش کی جا سکتی ہے ۔

ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ بڑی کلاسوں میں بعض موضوعات پر بعض تصنیف شدہ معیاری کتابیں اور بعض صورتوں میں قومیت، اقتصادیات، بنکنگ بلا سُود، اسلامی قانون وغیرہ کے متعلق ملک بھر کے اچھے اچھے مقالات کے مجموعے مرتب کر لیے جائیں ۔ عالمِ اسلام کے دوسرے لوگوں کی کاوشوں کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے ۔

کچھ پہلو ایسے ہوں گے اور مسائل آئیں گے جن کے لیے اُستاد یا لیکچرر کو بطور خود لیکچر یا سبق تیار کرنا ہو گا ۔ ایک یا زیادہ ۔

اس قسم کے عبوری تجرباتی دَور کے بعد مستقل نصابی کتابیں ہر سطح پر اور ہر علم کے لیے فراہم ہو جائیں گی ۔ اس کے لیے ملک بھر کے مفکرین و مصنّفین کو اچھے معاوضوں پر مقرر کر کے وہ مقاصد اور خاکوں کے مطابق کتابیں لکھنے کے لیے تیار کیا جا سکتا ہے ۔

سوال نمبر (۴)

دراصل یہ سوال کیا، سارا ہی سوالنامہ ایک کتاب لکھنے کا متقاضی ہے اور مختصر بھی لکھا جائے تو سوچنے کے لیے خاصا وقت چاہیے ۔

اس سوال کے تحت میں صرف پانچ چیزوں کا ذکر کروں گا ــــ

۱ــ درس گاہ اور گھر کا رابطہ: اُستاد جو کچھ بچوں کو یا بڑے طالب علموں کو سکھانا چاہتا ہو، علمی سطح پر یا اخلاقی و سماجی سطح پر، اس سے وہ متعلقہ گھروں کو آگاہ رکھے کہ وہ اپنے ماحول کو اس کے تعلیمی پروگرام سے ہم آہنگ رکھیں اور گھر کا ادارہ کوئی تضادات اور مزاحمتیں نہ رکھتا ہو۔

۲ــ مُلک کے ذرائع ابلاغ جو پورے معاشرے میں ایک خاص طرزِ فکر، ایک خاص معاشرتی معیار اور ایک خاص تہذیب و ثقافت پھیلا رہے ہوتے ہیں۔ ان کو حکومت تعلیم کی اسکیم سے ہم آہنگی اختیار کرنے کا پابند کرے۔ طلبہ اور نوجوانوں کے لیے جو نظریہ، نصب العین اور اخلاقی قدریں اور خدمتِ انسانیت کے مقاصد قومی تعلیم کے لیے طے کیے گئے ہیں ان سے کوئی ادارہ انحراف نہ کرے اور ان سے ٹکراؤ پیدا کرنے والا مواد نہ لائے۔

۳ــ اُستاد کو تعلیمی ترقی کا اصل ضامن قرار دے کر اُسے پُوری پُوری اہمیت دی جائے۔ اِس پیشے میں آنے والوں کی صرف تعلیمی استعداد ہی کو نہ دیکھا جائے، بلکہ ان کے خاندانی ماحول کی چھان بین کی جائے کہ آیا پہلے سے وہ فروغِ علم اور خدمتِ انسانیت کے ماحول سے متعلق چلے آ رہے ہیں یا نہیں۔ ان کے معیارِ اخلاق و شائستگی کا اندازہ لگایا جائے۔ پھر اُن کو بہت اعلیٰ درجے کی تربیت دی جائے اور معاشرے میں ان کو اعلیٰ مقام اعتبار دیا جائے۔ نفسیاتی طور پر ان کو حلیم اور محبت کیش اور مدبّر ہونا چاہیے۔

اساتذہ کے اجلاس، اساتذہ کے سیمینار، اساتذہ کے ریفریشر کورسز صرف اس مقصد کے لیے ہوں کہ توسیعِ تعلیم کے ساتھ ساتھ معیارِ تعلیم اور مقصدِ تعلیم کا حصول کیسے ہو، اور مختلف مدارج اور مختلف مضامین سے متعلق اساتذہ اپنی ذمہ داریاں کیسے پوری کریں۔

ہر سال دو سال بعد وہ خاص تعلیمی امتحانات اسی طرح پاس کریں جیسے فوج کے سپاہی اور افسران درجہ بدرجہ پاس کرتے اور آگے بڑھتے رہتے ہیں۔[1]

---

[1] اس طریقے سے ان کو جدید ترین معلومات و تجربات سے آگاہ رکھا جائے۔

۴ ۔ امتحانات سمسٹر سسٹم کے تحت ہی لیے جائیں، البتہ اس سسٹم کے کمزور رخنوں کو بند کر دیا جائے۔

۵ ۔ تعلیمی ترقی کی رفتار بڑھانے اور اخلاق سدھارنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ مخلوط تعلیم کا قطعی اور فوری انسداد کر دیا جائے۔

سوال نمبر (۵)

میرا خیال ہے کہ اس سوال کا جواب نمبر ۳ کے جواب میں آ گیا ہے۔

سوال نمبر (۶)

فوری رائے قائم کرتے ہوئے اچھے اچھے مفکرین تک یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ تعلیم گاہوں میں اساتذہ یا طلبہ کی تنظیمیں نہ ہونی چاہئیں۔ بلکہ بہت سی خرابیوں کا علاج ہی اس کو سمجھتے ہیں کہ اساتذہ کی تنظیمیں اور طلبہ کی یونینیں نہ رہیں۔ حالانکہ اس منفی تجربے کا نتیجہ بدتر نکلا ہے۔ مگر نتائج کا کبھی کسی وزیر یا ماہرِ تعلیم نے اندازہ ہی نہیں لگایا۔

یہ فارمولا اگر درست ہوتا تو ملک کے تمام شعبوں کو یونینوں اور تنظیموں اور تحریکوں کو خالی کر دینا چاہیے تھا۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ جس معاشرے کی ساخت یہ ہو کہ کچھ لوگ دوسروں کے حقوق چھینتے ہوں اور کچھ دوسرے مجبور ہوتے ہیں کہ اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھائیں، وہاں تنظیموں کو آپ کیسے روک سکتے ہیں جو آواز اٹھانے کا ذریعہ ہیں اور جن کے ذریعے کسی اقدام کے حق میں یا اس کے خلاف اندازہ ہوتا ہے کہ کتنی قوت اُدھر پائی جاتی ہے۔

جہاں رشوتیں اور سفارشیں اور جنبہ داریاں بڑھ گئی ہوں اور اس کی وجہ سے استادوں اور طالب علموں میں سے کچھ کو ناجائز فائدہ پہنچایا جائے اور کچھ کو بے جا تکلیف میں ڈالا جائے وہاں اگر تنظیمی قوت کو ضبط و نظم کے ساتھ کوئی اخلاقی مطالبہ نہ کرنے دیں گے یا رد کر دیں گے تو چاہے آپ تنظیم کو توڑ دیں، فضا کو پُرسکون

اور پُرامن نہیں بنا سکتے۔

پھر دوسرا بھاری قضیہ نظریاتی رابطوں اور ان کی وجہ سے تعصباتی حمایتوں اور مخالفتوں کا ہے۔ اس قضیے میں یونیورسٹی کے حکام، پروفیسر اور طلبا سب کسی نہ کسی حد تک شریک ہوتے ہیں۔ پھر اس معاملے میں زیادہ غور طلب حقیقت یہ ہے کہ بائیں بازو کی قوتیں بہت پہلے سے زندگی کے ہر دائرے میں — ٹیلی وژن، ریڈیو، اخبارات، محکمہ جاتی دفتروں اور درسگاہوں میں — اپنے آدمیوں یا حامیوں کو منظم کر کے ان کی سرپرستی کرتی چلی آ رہی ہیں۔ جب تک یہ یک طرفہ عمل جاری تھا اور ان کا واسطہ زیادہ سے زیادہ لادینی قسم کی یا زیادہ سے زیادہ قوم پرستانہ تنظیموں سے تھا تو امن تھا اور یونین ازم کے خلاف کبھی کوئی آواز نہیں اُٹھی۔ لیکن جونہی اس یک طرفہ جارحیت کے خلاف اسلامی جمعیت طلبہ اسلامی نظامِ تعلیم کی آواز کو لے کر میدان میں آئی معاملہ بگڑ گیا۔ پہلی دفعہ ایوبی دور میں انتخابات کے سلسلے میں جمعیت کے قائدین کو مارا پیٹا گیا۔ یوں تشدد کا آغاز ہوا۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا اور اگر باقاعدہ انکوائری ہو تو پشاور سے لے کر کراچی تک صاف معلوم ہو جائے گا کہ تشدد کا نشانہ زیادہ سے زیادہ بار جمعیت والے بنے ہیں۔ اور اگر انہوں نے کوئی کارروائی کی ہے تو وہ جوابی اور دفاعی تھی۔ پھر ستم یہ ہوا کہ ایوب صاحب کے دور کی طرح متعدد بار — اور خصوصاً ان دنوں — حکومت بھی جمعیت کے خلاف سرگرم ہے۔ اس اصولی گفتگو سے میرا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ "جمعیت" غلطیوں سے مبرا ہے۔

اس کا صحیح علاج یہ ہے کہ اگر حکومت غیر جانب دار رہنے کا فیصلہ کرے اور یونیورسٹی کے حکام ناجائز حمایتیں اور مخالفتیں چھوڑ دیں تو پوری محنت اس ماحول کو پیدا کرنے میں صرف کی جائے کہ اختلافات کے معاملہ میں کیا رویہ ہونا چاہیے۔ اساتذہ اس رویّے کا عملی مظاہرہ کریں اور طلبہ سے اس پر عمل کرائیں۔

اب تنظیموں کے دائرۂ کار کو لیجیے۔ کوئی تنظیم اگر اسلامی تعلیمات کو پھیلاتی ہے یا نئے طلبہ کو مدد دیتی ہے، یا درسگاہوں کو رقص و سرود کی اخلاق سوز سرگرمیوں سے پاک رکھنے کا مطالبہ کرتی ہے، یا ملکی ماحول کے اخلاقی بگاڑ کے خلاف غیر سیاسی طور پر آواز اُٹھاتی ہے تو ایسا کرنا جائز ہی نہیں، بہت ضروری ہے۔ اسی طرح انتخابات کے زمانے میں اس کے ارکان ووٹ دے سکتے ہیں، کسی بھی شخص یا جماعت کی حمایت یا مخالفت کر سکتے ہیں۔ بس اس سے زیادہ سیاسیاتِ ملکی میں ان کا کوئی کام نہیں۔ رہا دین کی دعوت اور تعلیم کو پھیلانے کا کام سو اسے وہ اپنے معاشرے میں کھلم کھلا کر سکتے ہیں اور دینی لحاظ

سے جن بھی افراد یا جماعتوں سے چاہیں، استفادہ اور رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔

اسی طرح اساتذہ کی ایسی تنظیمیں جو اسلامی فلسفۂ تعلیم، مسلم ماہرینِ تعلیم کے افکار اور تعلیمی مباحث و مسائل پر رہنمائی مہیا کرتی ہوں، اساتذہ اور طلبہ کو اسلامی نظریۂ تعلیم کے تحت رہنمائی دیتی ہوں، وہ تو بہت بڑا اثاثہ ہیں۔ ناجائز یہ بھی نہیں کہ کسی اُستاد کی بے جا حمایت و مخالفت کے متعلق یا طلبہ پر ہونے والی کسی زیادتی کے متعلق، یا تعلیمی پالیسی کی کسی حکومتی غلطی کی طرف یا استادوں کے حقوق کی طرف وہ توجہ دلائیں۔

جہاں جمہوری نظام ہوگا وہاں یونینیں اور تنظیمیں تو ہر شعبے میں ہوں گی۔ ہمیں صرف یہ کرنا ہے کہ انہیں اسلامی فکر و اخلاق کے چینل میں رہنے پر آمادہ کریں۔

یقین جانیے کہ اسلامی نظامِ تعلیم کم سے کم تعلیمی ایڈمنسٹریشن میں اپنی نشوونما کے لیے دیانت اور شرافت کا جو رنگ چاہتا ہے، وہ اگر پیدا کر لیا جائے تو پھر تعلیم گاہوں میں کوئی تصادم باقی نہیں رہ سکتا۔ یہ رنگ جب پھیلے گا تو استادوں اور طلبہ سب کی رُوحوں پر چھا جائے گا۔ اور یہ کام نہ ہو سکے تو آپ یونینیں توڑیں یا بنوائیں، کبھی پُرسکون تعلیمی ماحول پیدا نہ ہوگا، اور نہ اسلامی نظامِ تعلیم کی نشوونما ہو سکے گی۔

بس میں ان گذارشات کے ساتھ اپنی معروضات کو ختم کرتا ہوں اور معذرت چاہتا ہوں کہ بات مجمل نہ رہ سکی۔

موجودہ نظامِ تعلیم کی تبدیلی

(ایم اے ایجوکیشن کی ایک طالبہ کے سوالات)

سوالات

۱۔ موجودہ نظامِ تعلیم سے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

۲۔ کیا یہ نظامِ تعلیم قومی مقاصدِ تعلیم کو پورا کرتا ہے؟ کیا یہ ممکن ہوگا کہ اس نظامِ تعلیم کی

خامیوں کی نشاندہی فرما دیں ۔

۳ ۔ کیا یہ درست ہے کہ موجودہ ناقص نظامِ تعلیم کی وجہ سے قوم طبقات کا شکار ہو گئی ہے؟

۴ ۔ طبقاتی نظامِ تعلیم کو ختم کرنے کے سلسلے میں آپ کی کیا تجاویز ہیں؟

جواب: از نعیم صدیقی

۱ ۔ موجودہ نظامِ تعلیم ایک ایسی ٹوپی ہے جو ہمارے سر کے ناپ کے مطابق نہیں بنائی گئی ہے بلکہ یہ تنگ تثلیثی ٹوپی سر پر رکھ کر ہتھوڑے کی ضربوں سے فٹ کر دی گئی ہے ۔ اور وقتاً فوقتاً فٹ کی جاتی رہتی ہے ۔ اس کے کبھی ایک کونے کو بدلنے کے لیے اور کبھی دوسرے زاویے کو درست کرنے کے لیے ٹھکا ٹھک ہوتی رہتی ہے ۔ میرا خیال ہے کہ جن کیلوں سے یہ ہمارے سروں پہ مستقلاً نصب کر دی گئی ہے وہ کھوپڑی میں اُتر کر اپنی جگہ بنا چکی ہیں ، اور اب ہم سوچ بھی نہیں سکتے کہ اسے الگ کر کے کوئی دوسرا بندوبست کیا جا سکتا ہے ، کیونکہ ذرا سی جنبش بھی درد پیدا کرتی ہے ۔ یہ ٹوپی جو غلامی میں ہمارے سروں پہ ٹھونسی گئی تھی ، آزادی میں اس کی پکڑ اور سخت ہو گئی ہے ۔

مندرجہ بالا اشارے کا ترجمہ یہ ہے کہ اس نظامِ تعلیم کو ہمارے نظریہ حیات ، ہمارے ملی نصب العین ، ہمارے بنیادی تصورِ پاکستان ، ہمارے شعورِ اخلاق ، ہماری معاشرتی قدروں اور ہماری تہذیب سے بلکہ لسانی ذوق و ضرورت اور آزادی قوم کے مسائل سے کوئی تعلق نہیں ۔ اُلٹا یہ نظامِ تعلیم ان سارے تقاضا ہائے عوامِ ملت کو پاؤں تلے پامال کرتا ہے اور ہماری ہر قیمتی چیز کا مذاق اُڑا اُڑا کر اس نے ہمیں احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا ہے ۔ اِس نے ہماری خودی کو مُردہ ، ہمارے ضمیروں کو کُشتہ اور ہمارے سروں کو دوسروں کے سامنے خم کر دیا ہے ۔ اب ہماری خاصی بڑی تعداد کو جس میں دانشور اور معلّم اور صحافی اور ادیب اور لیڈر اور وزیر بھی شامل ہیں ، ہر وہ بگاڑ اور اذیت اور بے جوڑ پن ضروری معلوم ہوتا ہے جو اس نظام نے پیدا کر دیا ہے ۔ اب اس کے محافظین اور پہرہ دار اور سنتری بھی خود ہمارے گھروں میں مسلمان ماؤں کی گودوں میں ، اور مسلمان باپوں کے سایہ شفقت میں پرورش پا کر ڈیوٹیاں سنبھالے ہوئے ہیں ۔

اب تو اصلاحِ تعلیم اور تبدیلیٔ تعلیم کے جو تجربے ہوتے ہیں ، وہ بھی اس قدر کہ مشین کا ایک کیل

اِدھر سے نکال کر اُدھر ڈال دیا۔ یا کسی پرزے کی جگہ ذرا مختلف ساخت کا کوئی اور پرزہ ڈال دیا۔ مشین وہی میکالوی ہے۔ یہ تو اتنا بھی گوارا نہیں کرتی کہ ہماری قومی زبان اُردو ذریعۂ تعلیم بن سکے۔

۲۔ موجودہ نظامِ تعلیم کی بڑی خامی یہ ہے کہ اس نے اسلام کے تصورِ انسان کو تو بالکل درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھا، مزید ستم یہ کہ پاکستان کے لیے اس کے نظریے کے مطابق انسانِ مطلوب کا تصور بھی اختیار نہیں کیا کہ جس کو تعلیم کا محور و مقصد بنا کر سارے پہلوؤں کو سوچا جائے۔

یہ نظام نوجوانوں کو اپنے دینی یا تہذیبی وجودِ امتیازی اور جداگانہ تشخص کا شعور دلا کر ان میں اُمنگیں بیدار نہیں کرتا کہ وہ انسانیت کے سامنے زندگی کے زیادہ اُونچے اور پاکیزہ تصورات اور کردار کے نمونے لے کے جائیں اور بصد فخر اپنی متاعِ ملّی کو پیش کر کے اُس پر اثر انداز ہوں۔ اس طرح نوجوانوں کا تعاون ایک بہترین معاشرت و تہذیب کی تشکیل کے لیے حاصل کیا جائے۔

یہ نظام ہماری نسلوں کو یہ تربیت نہیں دیتا کہ وہ اپنے ایمان اور اپنے ضمیر کے مطابق بہترین اُصولوں اور قدروں اور روایتوں کو پروان چڑھائیں، اُن کے چراغوں کو روشن کریں اور اُن قیمتی ورثوں کے تحفظ کے لیے انہیں اگر دولت اور ہوسناکی اور بے حیائی اور جاہلی عصبیتوں کی چوکھی لڑائی میں اپنا مجاہدانہ کردار ادا کرنا پڑے تو وہ بصد مسرت لپک لپک کر اور اُچھل اُچھل کر اسے ادا کریں۔

وہ خود اپنے معاشرے میں مشنری اور معلم اور مُصلح اور انقلابی بن کر کام کریں اور اس میں راستی اور بھلائی کی ایک رَو چلا دیں۔ مگر آج وہ فلموں اور آڈیو وڈیو کیسٹوں، عریاں تصویروں، کیمرہ بازی اور سیاسی دائروں میں ناچ کُود کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ دلیل سے بات کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے، دلیل سُن کر اُس سے اثر نہیں لیتے، اختلافاتِ وجہ تشدد و تصادم بن جاتے ہیں۔ ان کو خیانت اور اسمگلنگ اور جرائم کے روگ اپنا شکار بناتے ہیں۔ گھروں، گلیوں اور سڑکوں پر گندگی ہے، جہاں کہیں ذرا بھیڑ ہو تو دھکم پیل اور شور شرابا بڑھ جاتا ہے۔ اِن سارے وجوہ سے ذہنوں میں اضطراب اور اعصاب میں تناؤ ہے، جس کے نتیجے میں قسم قسم کی پیچیدہ بیماریاں انسان کا مقدر بن گئی ہیں۔ یہ عجیب تعلیم ہے جس کے سائے میں آزادی کے بعد ۴۱ برس سے زیادہ عرصہ گذارنے پر بھی ہم حالتِ خوف میں مبتلا ہیں اور کئی کئی قسموں کے خوف آسیب بن کر ہر فرد پر سوار ہیں۔

۳۔ یہ سوال بھی دراصل اُوپر کے سوال ہی سے متعلق ہے۔ ایک سے زیادہ تعلیمی سسٹم

اور معیارات، انگریزی والے اسکول اور اُردو والے اسکول، حاکم و مقتدر طبقے کے بچوں کے لیے درس گاہیں اور عوام کے لیے درس گاہیں، ملکی مراکزِ تعلیم اور غیر ملکی مشنری مراکزِ تعلیم، ان چیزوں نے قوم کو ذہنی طور پر طبقاتی جزیروں میں تقسیم کر دیا ہے۔

۴۔ طبقاتی نظامِ تعلیم کو ختم کرنے کا طریقہ "توحیدی" ذہنوں کے لیے سوچنا کچھ مشکل نہیں۔ ایک ہی معیار و مصارف کے اسکول! ایک ہی نصاب اور نصابی کتب، ایک ہی جیسی وردیاں اور فیسیں، ایک ہی زبان ذریعۂ تعلیم اور ذریعۂ امتحانات۔ اس کے سوا کیا نسخۂ اصلاح ہو سکتا ہے؟

صرف ایک استثنیٰ ضروری ہے۔ ہمارے دینی احکام اور فطرت کے واضح اشارات تقاضا کرتے ہیں کہ خواتین کے لیے جداگانہ یونیورسٹیاں اور کالج ہوں، مگر تعلیمی سسٹم، نصاب، فیسیں، ذریعۂ تعلیم اور معیارات یکساں ہونے چاہئیں۔

(بقیہ اسلامی قانون جامد کیوں؟)

قوانین میں ایک حصہ قواعد و ضوابط کا ہے۔ یہ صحیح معنوں میں قانون نہیں ہے، بلکہ معاملات کو سہولت سے سرانجام دینے کے لیے طریقۂ کار ہے۔ اس میں جو بہترین طریقہ ہو اس کو اختیار کرنا چاہیے۔

اِس طرح اسلامی قانون، اسلامی شریعت دائمی (RIGID) اور تغیر پذیر (FLEXIBLE) دونوں حصوں کا مجموعہ ہے۔ اس لیے اسلامی قانون انسانی فطرت کے لیے زیادہ سازگار ہے۔ اس لیے یہ ہر زمان اور ہر مکان کے لیے موزوں ہے۔

تصحیح

ترجمان القرآن ماہ دسمبر ۱۹۸۸ء۔ مضمون علامہ ابن تیمیہؒ کا تفسیری ورثہ۔ صفحہ ۱۸/۱۹ سطر نمبر ۱ میں امام بخاریؒ کے بجائے "امام فراہیؒ" پڑھا جائے۔ (ادارہ)